التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

علامہ محمد حسین طباطبائی ...... صاحب تفسیر المیزان

ڈاکٹر زاہد علی زاہدی

Allama Muhammad Hussain Tabatabai has written one of the most valuable exegesis of Quran in the name of "Al Mizan fi Tafseer ul Quran" in Arabic language in 20 volumes. Allama Tabatabai was born in Tabrez, Iran. He has received his basic education from his home town then he moved to Najaf, Iraq where he learned Islamic Philosophy, Islamic Jurisprudence and Principles of Jurisprudence from renowned scholars. He has written many books on history, jurisprudence and doctrine of Islam but he is well known for his works on Islamic Philosophy. His annotations on Mulla Sadra Sherazi's al Asfar and his two books, Bidayatul Hikmah and Nihayatul Hikmah for the students of Islamic Philosophy are notable works but his remarkable work on Islamic Philosophy

is Usool-e-Falsafah wa Rawish-e-Rialism (the Principles of Philosophy and the methodology of Realism) a critical and comparative work on Western Philosophy and Muslim Philosophy.

In this article the biography of Allama Tabatabi has been discussed in length. His scholarly works, his teachers as well as students have been mentioned. It is notable that most of the teachers and scholars of Islamic Philosophy of present Iran and the leaders of Islamic revolution of Iran are students of Tabatabai including Mutahheri, Khamenei, Muntazari, Makarim Sherazi, Beheshti and Bahonar. Prof. Henry Corbin and Dr. Hosein Nasr of American Universities are also among his disciples. Also his marvelous commentary on Holy Quran Al-Mizan has been discussed with three dimensions i.e. Tafseer Quran bil Quran (Exegesis of Quran with the help of Quranic verses), the sociological aspects of Al-Mizan and the Philosophical aspects of Al-Mizan. These aspects givespecial status to tafseer Al Mizan.

ایران کے شمالی مغربی صوبہ آذربایجان کا مرکز اور تاریخی و علمی شہر تبریز ایک مردم خیز سرزمین ہے جہاں بڑی بڑی علمی شخصیات پیدا ہوئیں اور انہوں نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی۔ علامہ امینی صاحب الغدیر اسی شہر کا سرمایہ ہیں۔ جس شخصیت کا تعارف اس مقالہ میں کرایا جارہا ہے وہ بھی اسی شہر تبریز میں ایک سادات اور علمی گھرانہ میں ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے (۱) یعنی علامہ سید محمد حسین طباطبائی جو والد کی طرف سے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور والدہ کی

طرف سے امام حسین علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اپنے اجداد میں سے ایک نمایاں بزرگ ابن طبا طبا کی اولاد ہیں جنہوں نے بنی عباس کے زمانے میں قیام کیا اور درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔(۲) آپ کے دادا شیخ محمد حسین نجفی نے چالیس جلدوں میں فقہ استدلالی پر ایک معرکۃ الآرا کتاب جواہر الاکلام فی شرح شرائع الاسلام لکھی جو کہ علامہ حلی کی شرائع الاسلام کی شرح ہے۔ علامہ طباطبائی ابھی پانچ سال کی عمر میں تھے کہ والدہ رحلت فرما گئیں اور بعد ازاں جب آپ نو سال کی عمر میں پہنچے تو والد ماجد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بچپن اور جوانی میں اسی شہر میں تحصیل علم کیا اور بعد ازاں نجف اشرف چلے گئے جو کہ اس زمانہ میں عالم تشیع کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔ اپنے بچپن کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ " ابتدا میں جب میں صرف و نحو پڑھتا تھا تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور پڑھائی میں دل بھی نہیں لگتا تھا لیکن پھر خدا کی ایسی عنایت ہوئی کہ ایک دم سب کچھ سمجھ میں آنے لگا اور پھر میں اس طرح ہر درس میں بیٹھتا تھا کہ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ استاد کی کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی ہو یا استاد کی کسی بات میں اشکال پیدا ہوا ہو۔ نہ ہی میں استاد سے زیادہ سوال کیا کرتا تھا۔ الحمد للہ سترہ سال تک اسی طرح تعلیم حاصل کرتا رہا کہ کبھی تھکن کا احساس نہیں ہوا۔ بعض اوقات رات رات بھر مطالعہ کرتا یہاں تک کہ صبح ہو جاتی لیکن تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔" (۳)

وہ خود ایک مقام پر کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں مدارس میں نصاب کی موجودہ شکل نہیں ہوتی تھی بلکہ مختلف کتاب کی صورت میں طلاب کو پڑھایا جاتا تھا جس میں سرفہرست قرآن کریم تھا۔ بعد ازاں میں نے گلستان و بوستان، سعدی شیرازی، نصاب الصبیان ، انوار سہیلی ، اخلاق مصور، تاریخ معجم ،منشات امیر نظام و ارشاد الحساب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد عربی ادب کی باری آئی تو امثلہ ،صرف میر و تصریف نحو میں العوامل فی النحو ، انموذج ،صمدیہ ، الفیہ ابن مالک ہمراہ با شرح سیوطی و کتاب نحو جامی مغنی اللبیب ابن ہشام وغیرہ پڑھی۔ اس کے ساتھ معانی و بیان میں کتاب المطول تفتازانی، فقہ میں الروضۃ البہیۃ المعروف بہ شرح لمعہ شہید ثانی، مکاسب شیخ انصاری، اصول فقہ میں المعالم فی اصول الفقہ شیخ زین الدین قوانین الاصول میرزای قمی، رسائل شیخ انصاری، کفایۃ الاصول آیت اللہ آخوند خراسانی، اور منطق میں الکبری فی

المنطق ، الحاشیہ ،شرح الشمسیہ ،فلسفہ میں الاشارات و التنبیہات ابن سینا، علم کلام میں کشف المراد خواجہ نصیر الدین پڑھی اور فلسفہ متعالیہ و عرفان کو تمام کیا۔(۴) ان کتابوں کے نام لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ موجودہ دینی تعلیم کے نصاب میں اور روایتی تعلیمی نصاب میں ایک تقابل ہو سکے اور یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارے بزرگ علماء نے اپنے درسی نصاب میں کن کتابوں کو پڑھا اور کس طرح وہ اس مقام پر پہنچے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں تعلیم کا مقصد نہ سند کا حصول ہوتا تھا اور نہ نوکری کا بلکہ صرف اور صرف علم و آگہی کا حصول مقصد تعلیم ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ نہ داخلہ فارم ہوتا تھا نہ امتحان کا انتظام نہ رزلٹ نہ مارکس شیٹ بس تعلیم ہی واحد مقصد تھا۔

نجف اشرف پہنچتے ہی طباطبائی آیت اللہ شیخ محمد حسین اصفہانی کے اصول فقہ کے درس خارج میں شریک ہو گئے اور پھر چھ سال کے بعد آیت اللہ نائینی کے فقہ و اصول فقہ کا دورہ مکمل کیا جس میں آٹھ سال مزید لگے ساتھ ہی علم رجال کے لیے آیت اللہ کوہکری کے دروس میں حاضری دی۔ معارف الہیہ ، اخلاق اور حدیث کے لیے آپ نے اپنے زمانے کے عارف کامل آیت اللہ سید علی آقا قاضی طباطبائی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا جن کی سرپرستی میں آپ نے سیر و سلوک و مجاہدات نفسانیہ و ریاضات شرعیہ کے مقامات طے کیے۔(۵)

علامہ محمد حسین طباطبائی کو صاحب تفسیر المیزان کہا جاتا ہے کیونکہ وہ المیزان فی تفسیر القرآن کے مؤلف ہیں جو کہ عالم اسلام کی ایک نہایت بلند پایہ علمی و فلسفیانہ تفسیر ہے جس پر ہم مضمون کے آخر میں تبصرہ کریں گے تاہم علامہ طباطبائی کا نام تفسیر قرآن کے ساتھ ساتھ جس شعبہ میں شہرت دوام رکھتا ہے وہ ہے اسلامی فلسفہ۔ جس طرح مسلمانوں کے دیگر مکاتب فکر میں دینی حلقوں میں فلسفہ رفتہ رفتہ ناپید ہو گیا بلکہ مردود ٹھہرا اسی طرح شیعہ حوزہ ہای علمیہ میں بھی فلسفہ پر برا وقت آیا لیکن امام خمینی اور علامہ طباطبائی نے اس کو زندہ کیا اور بعض حلقوں کی تمام تر مخالفت کے باوجود وہ فلسفہ پڑھاتے رہے اور شاگرد تیار کرتے رہے۔ خود علامہ طباطبائی نے فلسفہ کس سے پڑھا؟ اس بارے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے استاد حکیم اسلامی سید حسین بادکوبہ ای تھے کہ جن سے میں نے منظومہ سبزواری، اسفار و مشاعر سبزواری، اسفار و مشاعر ملا صدرا، شفاء ابن سینا، کتاب اثولوجیای ارسطو، تمہید القواعد ابن ترکہ و اخلاق ابن مسکویہ

کو پڑھا۔ وہ کہتے ہیں کہ استاد بادکوبہ ای نے مجھے خاص تربیت دی اور فلسفہ کی گہرائی میں پہنچا دیا اور اس قابل بنایا کہ میں نے ان کی طرح طرز استدلال کو سیکھ لیا اور پھر انہوں نے خود مجھے حکم دیا کہ میں علم ہیئت اور علم نجوم کے لیے استاد بزرگوار سید ابوالقاسم خوانساری کے درس میں حاضری دوں۔ اس طرح میں نے ان سے ہیئت و نجوم کے علاوہ ریاضیات عالی اور علم ہندسہ بھی سیکھ لیا۔(۶)

علامہ طباطبائی نے فلسفہ میں ایسی کتابیں لکھیں جو کہ اس زمانے میں رائج مغربی فلسفہ کا جواب بھی تھیں اور اسلامی فلسفہ کا نصاب بھی۔ مغربی فلسفہ کے رد میں اسلامی فکر کے ساتھ انہوں نے کتاب اصول فلسفہ و روش ریالیسم لکھی جس کو بعد ازاں ان کے ہونہار شاگرد و استاد شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنے حاشیہ کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ فلسفہ کے طالب علموں کو ملا صدرا کی معروف تصنیف اسفار اربعہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اس کے لیے اسفار کی کئی شرحیں لکھی گئیں ہیں علامہ طباطبائی نے اسفار پر ایک حاشیہ لکھ کر اس مشکل کو آسان کرنے کی کوشش کی پھر بھی نئے طالب علموں کے لیے فلسفہ کے شعبہ میں داخل ہوتے میں ایک دشواری کا سامنا رہتا ہے کیونکہ جو کتابیں نصاب میں شامل ہیں وہ بنیادی طور پر نصاب کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں۔ یہ مشکل تقریباً علوم اسلامی کے ہر شعبہ میں موجود ہے۔ علامہ طباطبائی نے اس مشکل کو حکمت متعالیہ کی حد تک کم کرنے کی خاطر بدایۃ الحکمۃ اور نہایۃ الحکمۃ لکھی تاکہ طالب علم ابتدائی طور پر اگر یہ دو کتابیں پڑھ لے تو وہ فلسفہ کے عمیق مباحث میں وارد ہوسکتا ہے۔ نجف میں قیام کے دوران آپ نے کئی کتابیں لکھیں:

۱۔ رسالۃ فی البرھان
۲۔ رسالۃ فی المغالطۃ
۳۔ رسالۃ فی الافعال
۴۔ رسالۃ فی الترکیب
۵۔ رسالۃ فی الاعتباریات (الافکار التی یخلقھا الانسان)
۶۔ رسالۃ فی النبوۃ منامات الانسان

بعض معاشی مسائل کے سبب علامہ طباطبائی نے نجف اشرف سے تعلیم مکمل کرکے واپس اپنے شہر یعنی تبریز میں تبلیغ دین کا فیصلہ کیا تاہم خود ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس طرح تبلیغ و تحقیق کے مواقع میسر نہیں ہوئے جیسا کہ وہ چاہتے تھے پس انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایران کے علمی اور مقدس شہر قم کا رخ کیا جائے۔ تبریز میں دس سال قیام کے دوران وہ فارغ نہیں رہے بلکہ اس دوران انہوں نے درج ذیل کتابیں لکھیں:

۱۔ رسالۃ فی اثبات الذات
۲۔ رسالۃ فی الصفات
۳۔ رسالۃ فی الافعال
۴۔ رسالۃ فی الوسائط بین اللہ و الانسان
۵۔ رسالۃ فی الدنیا
۶۔ رسالۃ فی بعد الدنیا
۷۔ رسالۃ فی الولایۃ
۸۔ رسالۃ فی النبوۃ این رسالہ ھا در مقایسہ بین عقل و نقل است۔
۹۔ رسالۃ فی انساب السادات الطباطبائیین فی آذربایجان

۱۳۲۵ ہجری میں قم آنے کے بعد انہیں وہ روحانی اطمینان حاصل ہوا جس کی انہیں تمنا تھی حالانکہ تبریز میں وہ مادی اعتبار سے فارغ البال تھے اور اپنی آبائی زمین میں کاشت کاری کے ذریعے بہتر مادی زندگی بسر کر رہے تھے۔ قم میں ان کے ابتدائی گھر کے بارے میں ان کے فرزند سید عبد الباقی طباطبائی بیان کرتے ہیں کہ اس میں صرف دو کمرے تھے اور باورچی خانہ نہیں تھا لہٰذا ایک کمرے میں ہی باورچی خانہ بھی قائم تھا۔(۷) لیکن علامہ طباطبائی کا مقصد یہ سب کچھ نہیں تھا اس لیے آپ کو ایسے شاگرد مل گئے جن کی تربیت کے ذریعے انہوں نے اسلامی فلسفہ کو نئی زندگی عطا کی اور آج تقریباً ایک پوری صدی کی محنت کے نتیجے میں فلسفہ بارآور ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی وہ علمی نگارشات سامنے آئیں جن کے سبب قم جیسے علمی مرکز میں جہاں بڑے بڑے فقہاء و مجتہدین موجود ہیں جن کی علمی نگارشات سے کتب خانے اور کتاب فروشی

کے خلاف بھرے پڑے ہیں۔ آپ کے نام کے ساتھ علامہ کا لقب مستقل لگ گیا۔ شیعہ علماء و فقہاء میں علامہ کا لقب علامہ حلی کے بعد علامہ امینی اور علامہ طباطبائی کے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے (البتہ پاکستان اس سے مستثنیٰ ہے جہاں ہر ایک کے ساتھ تبرک کے طور پر لگا دیا جاتا ہے)۔ قم میں آپ نے درج ذیل کتابیں تالیف کی:

۱۔ المیزان فی تفسیر القرآن، بیس جلدوں میں عربی زبان میں معرکۃ الآراء تفسیر۔

۲۔ اصول فلسفه و روش رئالیسم، پانچ جلدوں میں مغربی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا تقابل۔

۳۔ تعلیقة علی کفایة الاصول، علم اصول فقہ کی کتاب پر حاشیہ

۴۔ تعلیقة علی کتاب الاسفار تالیف ملاصدرای شیرازی

۵۔ وحی یا شعور مرموز

۶۔ رسالہ ای در حکومت اسلامی بہ زبانہای فارسی، عربی و آلمانی

۷۔ گفتگو با پروفسور کربن درباره شیعہ جو بعد ازاں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

۸۔ گفتگو با پروفسور کربن سال درباره نقش تشیع در جہان امروز

۹۔ رسالة فی الاعجاز

۱۰۔ علی و الفلسفة الالهية، اس کا فارسی اور اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۱۔ شیعہ در اسلام، تاریخ تشیع پر مختصر لیکن جامع تحریر جو پروفیسر ہنری کربن کی فرمائش پر لکھی گئی۔

۱۲۔ قرآن در اسلام جس میں علوم قرآن اور مقدمہ تفسیر کے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

۱۳۔ تعریف شیعہ کے حوالے سے وہ تمام باتیں جو ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر کانٹ مورگان سے دوران گفتگو پیش کی گئیں۔

۱۴۔ سنن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ کہ محمد ہادی فقہی نے جس کو ۵۰۰ صفحات میں ترجمہ کیا ہے۔

علامہ طباطبائی قم میں اپنے فلسفہ کے دروس کے علاوہ تہران میں تفسیر قرآن کا درس دیا کرتے تھے جس میں کچھ مخصوص لوگ شرکت کرتے تھے۔ اس درس کے لیے وہ قم سے تہران بس کے ذریعے سفر کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ایسی تفسیر کی اشد ضرورت ہے

جو دور حاضر کے علمی چیلنج کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہو البتہ اس کام کے لیے انہوں نے عربی زبان کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ وہ چاہتے تھے کہ پورے عالم اسلام کو اس تفسیر سے استفادہ کا موقع مل سکے لہٰذا انہوں نے عربی میں یہ تفسیر لکھی۔(۸)

اب ہم علامہ طباطبائی کی اس معرکۃ الآراء تفسیر کی بعض خصوصیات پر بحث کریں گے جو کہ کتب تشیع ہی کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی ایک بڑی تفسیر ہے۔ بیس جلدوں پر مشتمل المیزان فی تفسیر القرآن علامہ طباطبائی کی محنت شاقہ اور علمی موشگافیوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ عالم تشیع کی علمی دنیا میں اس سے پہلے تک علامہ طبرسی کی تفسیر مجمع البیان کا نام سرفہرست تھا تاہم المیزان کی تالیف کے بعد شیعوں کی نمائندہ تفسیر المیزان قرار پائی۔ تفسیر المیزان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تفسیر قرآن بالقرآن ہے۔ یعنی پہلے مرحلے میں ہر آیت کی تفسیر کرنے سے پہلے اس موضوع پر موجود تمام آیتوں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر لیا گیا ہے اور پھر ان آیات سے قرآنی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علامہ طباطبائی نے اس روش کو ایجاد کیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ علامہ طباطبائی کی روش تفسیر پر ایک خوبصورت کتاب آقای علی اوسی نے لکھی ہے جس کا نام ہے الطباطبایی و منهجه فی تفسیره المیزان۔ وہ خود کہتے ہیں کہ بعض مواقع پر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی قرآنی آیت کی تفسیر دوسری آیت سے کی ہے ایک مثال دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ فسر الرسول الأعظم قوله تعالی: ولم یلبسوا ایمانهم بظلم (انعام/ ۸۲)، لم یلبسوا ایمانهم بالشرک و استدل بقوله تعالی: ان الشرک لظلم عظیم (لقمان/ ۱۳)۔

دوسرے جملے حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ہیں کہ القرآن یشهد بعضه ببعض، القرآن یفسر بعضه بعضا۔ یعنی قرآن کریم کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی شہادت دیتا ہے۔

ایسی مثالیں بعض صحابہ کرام کی تفسیر میں بھی ملتی ہیں مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے آیت قالوا ربنا امتنا اثنتین و احییتنا اثنتین اور آیت کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم کو ایک دوسرے کا شاہد

قرار دیا۔

علامہ طبری، زمخشری اور ابن تیمیہ نے بھی بعض مواقع پر یہی روش اپنائی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ طباطبائی اس روش کے بانی نہیں ہیں لیکن جس انداز سے انہوں نے پورے قرآن کریم میں اس روش کو پیش نظر رکھا ہے اور ہر ہر آیت کی تفسیر میں اس اصول کو اپنایا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ فرض کریں کسی آیت کی تفسیر میں طبری نے بھی دیگر آیتیں پیش کی ہیں اور طباطبائی نے بھی تاہم طباطبائی نے اتنی زیادہ مثالیں پیش کی ہیں اور اس قدر واضح مثالیں دی ہے کہ مطلب زیادہ روشن ہوجاتا ہے اور مجمل بیان مفصل بیان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اکثر تفاسیر میں کسی آیت سے اگر کئی معنی نکل رہے ہوں تو ایک یا دو معنی پر اکتفا کیا گیا ہے اور زیادہ معانی بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے کہ کہیں تفسیر بالرای نہ ہوجائے۔ اکثر ایک معنی پر دوسرے معنی کو ترجیح دینے کے بجائے ایک سے زائد معنی کو صحیح قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے تاہم تفسیر المیزان میں اس کے برخلاف بیسیوں معنی ذکر کیے گئے ہیں اور پھر مفسر نے اپنی ترجیح کو دلائل کی مدد سے دیگر مفاہیم پر سبقت دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ المیزان میں قرآنی و اسلامی اصطلاحات کی وضاحت کے لیے بھی آیات قرآنیہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً توحید، دعا، جہاد، رزق، برکت جیسی اصطلاحات جو کہ زبان زد عام ہونے کی وجہ سے بعض اوقات اپنا حقیقی مفہوم کھودیتی ہیں اور معروف معنی میں مستعمل ہونے لگتی ہیں اور جس سے بعض اوقات علمی حلقوں میں بھی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ علامہ نے ان اصطلاحات کے لیے اس طرح قرآنی آیات سے استفادہ کیا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم قاری کے ذہن میں اتر جاتا ہے۔

ایک دلچسپ چیز جو کہ المیزان کے ذریعے سامنے آئی وہ یہ کہ تفسیر قرآن بالقرآن کے نتیجے میں آیات کی موضوعی تفسیر خود بخود تیار ہوتی چلی گئی اور اس طرح المیزان ایک تفسیر موضوعی بھی بن گئی۔ المیزان کی خوبی یہ بھی ہے کہ علامہ کے سامنے ہی اس کی عربی اور پھر فارسی میں تین جلدوں پر مشتمل اس کی فہرست موضوعی تیار ہوگئی جس میں موضوعات کے علاوہ اعلام، آیات اور احادیث وغیرہ کی فہرست بھی شامل ہے جس کے مؤلف آقای الیاس کلانتری ہیں۔ المیزان کے سامنے فہرست موضوعی رکھ لی جائے تو المیزان ایک عظیم دائرۃ المعارف کی صورت اختیار کر لیتی

ہے جس میں اسلامی موضوعات پر نہایت علمی مقالے موجود ہیں۔ شاید انہی خوبیوں سے متاثر ہوکر تفسیر المیزان کی کچھ جلدوں کے مترجم اور علامہ طباطبائی کے ایک شاگرد آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر موضوعی کا سلسلہ شروع کیا ہے جو تا حال جاری ہے۔ اس طرح تفسیر کی ایک نئی قسم سامنے آئی۔

تفسیر المیزان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تفسیر کے دوران عمرانی علوم کے مباحث کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور شاید یہ اس اعتبار سے واحد تفسیر ہے کہ جو عمرانی علوم کے نقطہ نگاہ سے لکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا تعلق فقط فرد کی انفرادی زندگی سے نہیں ہے بلکہ اسلام ایک معاشرتی دین ہے اور اس کی تمام تر تعلیمات پورے معاشرے کے لیے ہے اور اس حوالے سے قرآن کریم میں بہت کچھ آیا ہے تاہم اب تک اس بارے میں بہت کم کام ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے قرآنی عمرانیات پر کتابیں بھی لکھی ہیں تاہم اب تک کوئی ایسی تفسیر سامنے نہیں آئی جس میں عمرانی پہلوؤں کو خاص اہمیت دی گئی ہو۔ علامہ طباطبائی نے اس اعتبار سے ایک نیا پہلو پیش نظر رکھ کر تفسیر لکھی۔ سب سے پہلے وہ ہر آیت کے موضوع پر دیگر آیات پیش کرتے ہیں، پھر اس موضوع پر احادیث و روایات کو درج کرتے ہیں اور پھر اگر اس کا کسی بھی اعتبار سے عمرانی علوم سے تعلق ہو تو اس کو خاص اس اعتبار سے زیر بحث لاتے ہیں۔

المیزان فی تفسیر قرآن کا تیسرا نہایت اہم پہلو اس کا فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہونا ہے۔ علامہ طباطبائی ایک مفسر کے ساتھ ساتھ فلسفہ کے استاد بھی تھے۔ ان کی کتابیں اصول فلسفہ و روش ریالیسم، بدایۃ الحکمۃ اور نہایۃ الحکمہ اسلامی فلسفہ اور مغربی فلسفہ پر ان کی گہری نظر کی جانب اشارہ ہے۔ علامہ طباطبائی ان لوگوں میں سے ہیں جو فلسفہ کو شجر ممنوعہ سمجھنے کے بجائے اس کو خدا، کائنات اور انسان کے درمیان ایک عقلی و منطقی رابطہ کی مابعدالطبیعاتی تشریح سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں قرآن کریم میں اس رابطہ کی بحث آئی ہے وہاں انہوں نے بوعلی سینا اور ملا صدرا شیرازی کی راہ پر چلتے ہوئے اس کی فلسفیانہ توجیہ پیش کی ہے۔ حکمت اسلامی جس کو حکمت متعالیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ انسان کو خدا تک لے جاتی ہے اور یہ دیگر فلسفیانہ نظریات

سے یکسر مختلف ہے جو انسان کو گمراہ کرتی ہے یا خدا کے وجود کا انکار کرتی ہے اور جس کے رد میں امام غزالی نے تہافۃ الفلاسفہ لکھی۔ المیزان نے حکمت متعالیہ کو ایک نئی روح عطا کردی ہے اور جو لوگ ہر طرح کے فلسفہ کو دین کا دشمن سمجھتے ہیں ان کے لیے یہ ایک مسکت جواب ہے۔اسی طرح جو لوگ مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور سمجھتے ہیں انسان اور کائنات کے ارتباط کے بارے میں صرف مغربی فلسفہ تشفی بخش جواب دیتا ہے ایسے لوگوں کو المیزان کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ دیکھیں کہ قرآن کریم اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

علامہ طباطبائی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں تفسیری روش کے چار عوامل بیان کیے ہیں۔ پہلا عامل یہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ و تابعین نے آیات کے ادبی پہلو، شان نزول، مختصر استدلال اور تاریخی واقعات اور مبداء و معاد کے بارے میں احادیث سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں اس میں علم کلام کی بحثیں شامل ہوگئیں۔ دوسری جانب پہلی صدی ہجری کے آخر میں فلسفہ یونان کی آمد سے عقلی مباحث کا آغاز ہوگیا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وسعت اختیار کرگیا۔ تیسری جانب فلسفیانہ و عقلی مباحث کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں تصوف اور عرفانی مباحث نے بھی اپنی جگہ بنائی جس کے نتیجے میں دینی معارف و حقائق کو لفظی و عقلی دلیل و برہان کے بجائے مجاہدہ و ریاضت نفس کے ذریعے حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ چوتھی سمت یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے قرآنی آیات کو روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ ہی کے ذریعے سمجھنے اور ان کے معانی کے ادراک کی بابت آیات کے ادبی پہلوؤں کے علاوہ کسی بھی دوسری جہت میں بحث و تحقیق اور غور و فکر کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

طباطبائی کہتے ہیں کہ یہ وہ چار عوامل تھے جن کے باعث قرآن مجید کی تفسیر میں علماء و محققین کی روش میں یکسانیت نہ رہی اور سب سے بڑھ کر تفسیر کے باب میں اہل علم تحقیق کی روش و طریقہ بحث کے مختلف ہونے کا سبب ان کے مذاہب و مسالک کا مختلف ہونا تھا اور اسی مذہبی تفرقہ و مسلکی اختلاف کے سبب مسلمانوں کے درمیان کلمہ توحید و رسالت یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ظاہری الفاظ کے علاوہ کسی بات پر اتفاق رائے قائم نہ ہوسکا اور اس کے علاوہ ہر مسئلہ میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا، چنانچہ خداوند عالم کے اسماء مبارکہ، صفات مقدسہ و افعال

کریمہ، آسمانوں اور جو کچھ ان میں ہے، زمین اور جو کچھ اس میں ہے، قضا و قدر، جبر و تفویض، ثواب و عقاب، موت، برزخ، بعث و نشر، قبر سے اٹھنا، قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں حاضری، بہشت و دوزخ مختصر یہ کہ ان تمام مسائل کے معانی و مفاہیم میں اختلاف نظر پیدا ہوگیا جن کا تعلق کسی بھی پہلو سے دینی حقائق و معارف سے تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اسلام میں قرآنی آیات کے معانی کو سمجھنے کی روش اور طریقہ بحث میں اختلاف پیدا ہوا اور ہر ایک گروہ نے اپنے مذہب کے مطابق تفسیر قرآن کا مخصوص طریقہ وضع کرلیا۔(۹)

علامہ طباطبائی نے بعض محدثین کی اس تفسیری روش پر تنقید کی ہے کہ جس میں وہ صرف ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں جن کے بارے میں کوئی حدیث یا روایت موجود ہو اور اس کے علاوہ توقف کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور اسی کو تفسیر بالماثور سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کا یہ موقف غلط ہے کیونکہ اس طرح انہوں نے عقل و فکر کی قوتوں کو بے کار کردیا اور تفکر و تدبر کے عمل کو بے سود قرار دے دیا اور صرف روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے تمسک اختیار کرنے پر اکتفاء کیا جبکہ ایسا کرنا درست نہیں کیونکہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب، قرآن مجید میں عقل کو حجت قرار دینے کی ہرگز مخالفت و ممانعت نہیں کی اور نہ ہی عقلی حقائق کو غلط و نادرست قرار دیا ہے اور یہ بات کیونکر ممکن و معقول ہے کہ قرآن عقل و فکر کو حجت قرار نہ دے جبکہ قرآن مجید اور اس کے کلام خدا ہونے کی اصل دلیل ہی عقل ہے لہٰذا صورت حال اس کے برعکس ہے۔(۱۰)

علامہ سید محمد حسین طباطبائی نے اپنی بھرپور علمی زندگی میں جہاں قابل قدر تصانیف چھوڑی ہیں وہیں اپنے شاگردوں کی بھی ایسی قطار چھوڑ کر گئے ہیں جو ان کے بعد بھی ان کی راہ پر چلتے ہوئے حکمت اسلامی کی خدمت میں مصروف ہیں اور مزید ہزاروں شاگرد تیار کررہے ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے اہم رہنماؤں کو اگر دیکھا جائے تو زیادہ تر فکری کام کرنے والے امام خمینی اور علامہ طباطبائی کے شاگرد نظر آئیں گے اور یہ دونوں ہی فلسفہ کے اساتید ہیں البتہ امام خمینی نے فلسفہ پر کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جبکہ علامہ طباطبائی نے اس حوالے سے اہم کام کیے۔ ایران کے موجودہ رہبر انقلاب آیت اللہ خامنہ ای بھی علامہ طباطبائی کے شاگردوں

میں سے ہیں۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہری جن کی فکر کو ایران میں سرکاری طور پر سرپرستی حاصل ہے اور جن کی شہادت پر امام خمینی نے کہا تھا کہ مطہری میری عمر کا حاصل تھا، وہ بھی امام خمینی کے ساتھ ساتھ علامہ طباطبائی کے شاگرد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام خمینی اپنی سیاسی تحریک کے سبب شاہ ایران کے عتاب کا شکار ہوئے اور طویل عرصہ تک عراق، ترکی اور فرانس میں جلاوطن رہے اس دوران علامہ طباطبائی قم میں جن شاگردوں کی تربیت کر رہے تھے وہ انقلاب کی فکری بنیادوں کی تعمیر میں مصروف تھے اور آج بھی وہ انقلاب کی فکری بنیادوں کے محافظ ہیں۔ استاد مطہری کے بارے میں طباطبائی فرماتے ہیں کہ جب درس میں مطہری آتے تھے تو خود ان کا شوق رقصاں ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسین بہشتی بھی علامہ کے شاگرد تھے جو پارلیمنٹ کے اسپیکر کے عہدے پر فائز ہوئے اور بعد ازاں اپنے بہتر (۷۲) ساتھیوں کے ساتھ حزب اسلامی کے دفتر میں بم دھماکے کے نتیجے میں شہید ہو گئے۔ بہشتی کے جگری دوست اور انقلاب اور پارلیمنٹ کے ساتھی ڈاکٹر باہنر بھی علامہ کے شاگرد تھے اور دونوں ساتھ ہی درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ امام خمینی کے فرزند سید مصطفیٰ خمینی بھی طباطبائی کے شاگرد رشید رہے جن کو نجف میں انقلاب سے قبل شہید کر دیا گیا۔ انقلاب کے ایک اہم شہید استاد مفتح ہیں جو علامہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ علامہ کے ایک نامور شاگرد امام موسیٰ صدر بھی ہیں جو لبنان کے شیعوں کے انقلابی رہنما تھے اور لیبیا کے ایک سرکاری دورے کے دوران غائب ہو گئے اور جن کا آج تک سراغ نہیں مل سکا۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے جو کہ علامہ طباطبائی کے بہت قریب رہے ان کی فرمائش پر المیزان کی بعض جلدوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ آج کل وہ ایران میں سب سے بڑے مجتہد سمجھے جاتے ہیں اور بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس وقت ایران میں دو بہت بڑے فلسفہ کے استاد آیت اللہ جوادی آملی اور آیت اللہ حسن زادہ آملی ہیں یہ دونوں ہی علامہ طباطبائی کے شاگرد ہیں جو اپنی علمی صلاحیتوں سے ہزاروں طالب علموں کی تربیت کر رہے ہیں۔ ایک بڑا نام آیت اللہ مصباح یزدی کا ہے جو بیسیوں کتابوں کے مصنف اور فلسفہ، کلام، تاریخ اور فقہ کے بڑے استاد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ آیت اللہ حسین حسینی تہرانی، سید جلال الدین آشتیانی، شیخ عباس ایزدی، سید عبدالکریم موسوی اردبیلی، عز الدین زنجانی، ابراہیم امینی،

یحییٰ انصاری، سید محمد باقر ابطحی، حسین نوری ہمدانی، سید مہدی روحانی، علی احمدی میانجی، احمد احمدی، ڈاکٹر غلام حسین ابراہیمی دینانی، ڈاکٹر سید یحییٰ یثربی کے نام قابل ذکر ہیں۔

علامہ طباطبائی ۱۹۸۱ء کو قم میں طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے اور انہیں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں حرم معصومہ قم(۱۱) کے اس گوشہ میں دفن کیا گیا جہاں سینکڑوں علماء و فقہاء آرام کر رہے ہیں اور جس مسجد میں ہزاروں طالب علم ہر وقت علمی مباحثہ میں مشغول رہتے ہیں۔ ہزاروں زائرین جب یہاں معصومہ قم کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو علامہ طباطبائی کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھتے ہیں۔

حوالہ جات

1.An Introduction to the al-Mizan by Abu al-Qassim Razzaqi, Al-Allamah al-Sayyid Muhammad Husayn al-Tabataba'I (1281 - 1360/1901-1980) is one of the greatest and the most original thinkers of the contemporary Muslim world. (www.quran.org.uk/articles/ieb_quran_almizan.htm)

۲۔ ابن طباطبا ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن ابراہیم بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب علیہ السلام نے سال ۱۹۹ ہجری میں خلافت مامون رشید کے عہد میں عباسی حکومت کے خلاف قیام کیا اور رقہ کے مقام پر زہر سے شہید کر دیے گئے۔ (لغت نامہ دہخدا، www.loghatnameeh.org)

۳۔ http://www.tajalliemalakut.com/Allameh-tabatabaie.aspx

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ http://www.azha.ir/showthread.php?tid=106

۷۔ http://www.ogie.org.ir/shavad.asp?id=123&avaid=432

۸۔ اپنی اشاعت کے ساتھ ہی المیزان کا فارسی میں بھی ترجمہ شروع ہوگیا اور عربی میں یہ تفسیر ایران کے علاوہ لبنان سے بھی شائع ہوئی ہے۔ اب تک اس کی تین جلدیں اردو میں آچکی ہیں۔

۹۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۲۰، ترجمہ مولانا حسن رضا غدیری، معراج کمپنی پاکستان، لاہور ۲۰۰۲۔

۱۰۔ ایضاً ص ۳

۱۱۔ حرم معصومہ قم، ایران کے معروف مذہبی شہر قم میں موجود حضرت فاطمہ معصومہ کے روضے کو کہتے ہیں جو حضرت امام رضا علیہ السلام کی بہن اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی دختر ہیں۔ ان کی قبر کی زیارت کے لیے دنیا بھر سے زائرین سال بھر آتے ہیں۔

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۲۰، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے تعلیمی افکار

ڈاکٹر حمیرا ناز

Muslim leaders of sub continent had performed the duty of ideological and epistemological guidance against the colonial power of British Empire through their knowledge, wisdom and action in every walk of life for the revival and restoration of Islamic civilization, and made a history which will no doubt be written in golden words in the history of sub continent, of course it is matter of proud for the Muslim population of Sub Continent. Among these great scholars, leaders of Ummah and history maker personalities, the name of Molana Saeed Ahmed Akber Abadi can not be ignored who played very prominent role in re awakening of the Ummah through their writings and authorship. His major

achievement in this regard was the establishment of NADWATUL MUSANIFFIN furthermore he guided Muslim Ummah through its representative magazine BURHAN in the field of education as well. He wrote long and short essays in BURHAN on educational themes to create educational awareness among Muslim. In present essay, we have collected and compiled his essays on the theme of education and try to evaluate the depth and breadth of his educational views, for which he is placed on seat of great theologian, reformist and educationalist.

ہندوستان میں برطانوی استعمار کے عزائم اور مقاصد سیاسی بھی تھے اور تہذیبی بھی۔ سیاست پر غلبہ وتسلط کے بعد برطانوی حکومت نے تہذیبی اور تعلیمی شعبے کو ہدف بنایا اور ایک نئی زبان، نئی تہذیب اور ایک نئے ثقافتی کلچر کو فروغ دیا جس کا بنیادی مقصد اسلام کو ضعف پہنچانا اور عیسائیت کو تقویت دینا تھا۔اس مقصد کے تحت ایک طرف انگریز حکومت نے ایک ایسا نظام تعلیم اور نصاب وضع کیا، جس کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں میں اُن کی اپنی تہذیب وتمدن کے بارے میں تشکیک اور مغرب اور مغربی تہذیب کے بارے میں مرعوبیت پیدا کرنا تھا تو دوسری طرف عیسائی مشنری اداروں کی سرپرستی کے ذریعے عیسائیت کو فروغ دینا تھا۔

تاہم یہ ایک خوش آئند حقیقت ہے کہ مسلمان علماء و مفکرین اور تعلیمی ماہرین نے برطانوی استعمار کے مذموم مقاصد کا صحیح ادراک کیا اور اس کے تدارک کے لئے ٹھوس اقدامات کئے۔ اس حوالے سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ، دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین اسی طرح کے بیسیوں ادارے ہیں جنہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علمی جدوجہد کی تاریخ رقم کی۔

اس علمی جدوجہد میں ایک نام مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸ء۔۱۹۸۵ء) کا بھی ہے۔ جنہوں نے اپنے قلم و افکار کے ذریعے ملتِ اسلامیہ ہند کی نازک وقت میں رہنمائی کی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی عصر حاضر کے ایک بڑے عالم اور علوم اسلامیہ پر غائر نظر رکھنے والے علمائے اسلام میں سے تھے۔ مولانا کے تحصیل علم کا سفر دینی درسگاہوں سے لے کر عصری جامعات تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھے تو دوسری طرف ان کا تعلق جدید علمی مراکز سینٹ اسٹیفن کالج اور خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تھا۔ اس طرح قدیم و جدید کے علم کا امتزاج اور ہم آہنگی نے اُن کی شخصیت کو ایک امتیازی مقام عطا کیا، جو آپ کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک کثیر الجہت سیرت و شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک طرف بلند پایہ عالم دین، محقق، ادیب، مؤرخ اور مدرس و خطیب تھے تو وہیں آپ کی شخصیت کا ایک پہلو ایک مفکر اور مصلح کا بھی ہے۔ آپ نباضِ وقت، خیر خواہ قوم و ملت اور عصر حاضر کے مسائل و تقاضوں کا گہرا ادراک و شعور رکھنے والے باکمال اور نابغہ روزگار شخصیت بھی تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اُن اکابرین میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں میں تعلیمی شعور کو اُجاگر کرنے کے لئے اپنے رفقاء (مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی) کے ساتھ مل کر ایک علمی اور تحقیقی ادارے "ندوۃ المصنفین" کی بنیاد ڈالی اور اس کے ترجمان رسالے برہان کے ذریعے مسلمانوں کی علمی و فکری تربیت اور رہنمائی کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کی تاکہ اُن میں حقیقی فکر و عمل کی استعداد پیدا کر کے انہیں روشن دماغ قوم بنایا جا سکے[۲]۔ کیونکہ آپ اس بات سے آگاہ تھے کہ مسلمان زندگی کے تمام شعبہ جات میں پیچھے ہیں بالخصوص علمی اور اقتصادی میدان میں۔ لہٰذا اس بناء پر یہ بات عیاں تھی کہ مسلمان اس ملک کے آئندہ سماجی جسم کے ایک مضبوط اور توانا عضو کی حیثیت سے اُس وقت تک ہرگز نہیں رہ سکتے جب تک کہ ان کو اولاً تعلیم اور اقتصادی میدان میں اپنے برادران وطن کے ساتھ چلنے کے قابل نہ بنادیا جائے گا[۳]۔ اسی لئے آپ تعلیم کے شعبے میں بے لاگ اصلاحات کے خواہاں تھے۔ اور اسے عصری

تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اکبر آبادی نے تعلیمی شعبے کی مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا اور تعلیمی شعبے کی خامیوں اور نقائص کی نشاندہی کی اور تعلیمی مبادیات و مباحث کے تمام جزو کل کو وقت کے حالات و تقاضوں کی روشنی میں پیش کیا۔ مولانا اکبر آبادی نے برہان میں تعلیمی موضوعات پر طویل اور مختصر مضامین اور مقالات تحریر کئے اور ان مقالات و مضامین میں مولانا نے تعلیمی مبادیات، مقاصدِ تعلیم، نظام و نصابِ تعلیم، تعلیمی مسائل، قومی تعلیمی پالیسی کو موضوع بحث بنایا ہے ہم ذیل میں مولانا کے ان ہی تعلیمی افکار کا جائزہ لیں گے۔

مقاصدِ تعلیم

تعلیمی شعبے کی اصلاح و تعمیر کے حوالے سے مولانا اکبر آبادی کے نزدیک درج ذیل اولین اساسی مقاصد تھے:

(الف) مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی تحصیل کی طرف راغب کرنا، اُن میں تصنیف و تالیف کی اہمیت کو اُجاگر کرنا اور علمی و ادبی ورثہ کے تحفظ اور ترقی کی جانب متوجہ کرانا آپ کے تعلیمی مقاصد میں شامل تھا[۴]

(ب) عربی زبان کی ترویج و اشاعت بھی آپ کے نزدیک اہم تھی[۵]

(ج) تعلیم کا اصل منشاء بتا کر ذہن و دماغ کی صحیح تربیت، استوار ذہنیت کا پیدا کرنا اور کیریکٹر بنانا بھی آپ کا مقصود تھا۔ لیکن اس کے لئے آپ علمائے کرام کی ذمہ داری سمجھتے تھے[۶]

(د) علمی ذوق کو پروان چڑھانے کے لئے مسلمانوں کو علمی تحقیق و تفتیش کی طرف راغب کرانا بھی آپ کے پیشِ نظر تھا۔[۷]

مقاصدِ تعلیم۔ تشریح و توضیح:

مولانا اکبر آبادی نے مذکورہ بالا مقاصد کی تشریح و توضیح بھی کی اور ہر تکتے کی وضاحت بھی کی ہے۔

(ا) علمی و ادبی متروکات کی حفاظت اور جدید علوم وفنون کی تحصیل:

مولانا اکبر آبادی نے مسلمانوں کو زندہ قوم بننے کے لئے اپنے پرانے سرمایہ علوم و فنون کی حفاظت اور دوسری جانب جدید علوم وفنون اور عصری ادبیات میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا کر کے اپنے ملکی ذخیرہ ادب کو ترقی یافتہ بنانے اور اسے وسیع سے وسیع تر بنانے پر زور دیا[۹]۔ کیونکہ آپ کی نظر میں یہی اقوام عالم کی ترقی کا راز ہے اور اسی پر تہذیبی اور ثقافتی عظمت کا دارومدار بھی ہے[۱۰]۔ لہٰذا اس کی اہمیت کے پیش نظر آپ نے اپنے قدیم سرمایہ علوم وفنون کی حفاظت کا بندوبست کرنے کے لئے چند تجاویز بھی دی ہیں۔ (۱) آپ نے اس کے لئے عزم و حوصلہ کے ساتھ ان کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کرنے پر زور دیا (۲) اور ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنے کی بھی رائے دی ہے[۱۱]۔ اور اس ضمن میں آپ نے اجتماعی کوششوں کو سودمند قرار دیا اور اس کے لئے مسلمانوں کو ملی تنظیم وتعمیر کا ایک ہمہ گیر پروگرام بنا کر اس کام کو شروع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کہنا تھا کہ عربی، فارسی، اُردو کی پرانی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ چھاپنے کا بندوبست کیا جائے اور جو انفرادی طور پر یہ کام کرنا چاہیں تو اس سلسلے میں آپ نے متمول ارباب مطبع کو بھی پرانی کتابوں کی طباعت کا زیادہ سے زیادہ انتظام کرنے کی رائے دی ہے[۱۲]

(ب) عربی زبان کی ترویج واشاعت:

عربی زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپ کا کہنا ہے کہ عربی زبان کو اسلامی کلچر، اسلامی تہذیب، اسلامی روایات کے ساتھ گہرا تعلق ہے[۱۳]۔ لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا کلچر محفوظ رہے، ہماری روایات زندہ رہیں اور ہماری زندگی میں اسلامیت کا عنصر نمایاں ہو تو آپ کی نظر میں اس کے لئے ہندوستان میں عربی زبان کی ترویج واشاعت اور اس کی ترقی وتہذیب کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا ناگزیر ہوگا۔[۱۴]

عربی زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر عربی زبان کی ترقی کا مسئلہ جس قدر اہم اور توجہات کا مستحق تھا مدارس کا اس سے تغافل اور بے پرواہی کا عملاً ثبوت دینے پر آپ نے

افسوس کا اظہار کیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ آج ہندوستان کے شہر شہر اور قریہ قریہ میں عربی کی ایک دو نہیں کئی درسگاہیں قائم ہیں۔ جہاں جوق درجوق طلباء سات سات، آٹھ آٹھ سال علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم عربی زبان میں حاصل کرتے ہیں پھر ان علوم میں عربی ادب کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے اور افصح العرب والعجم کا کلام بلاغت التیام بھی مکرر سہ کرر پڑھا جاتا ہے لیکن ان ہزاروں ہزار عربی پڑھنے والوں میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کو واقعی عربی زبان آتی ہے اور جو واقعی عربی کا صحیح مذاق رکھتے ہوں، اس میں تقریر کرسکتے ہوں اور تحریر لکھ سکتے ہوں۔ مولانا یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی انگریزی کالجوں میں پڑھنے والے طلباء کو عربی نہیں آتی تو ہم کو ان سے زیادہ شکوہ سنج ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اُن لوگوں کو عربی محض ضمنی طور پر پڑھائی جاتی ہے البتہ اُن حضرات کی طرف سے کیا معذرت پیش کی جاسکتی ہے جو کئی کئی سال محض عربی میں تعلیم پاتے ہیں اور پھر بھی عربی کی ایک سطر صحیح لکھنے یا ایک جملہ بولنے کی بھی ان میں قدرت نہیں ہوتی ہمیں اپنی اس کوتاہی کا احساس اُس وقت زیادہ ہوتا ہے جبکہ مصر وشام کا کوئی عالم کسی عربی مدرسے میں پہنچ جاتا ہے اُس وقت ارباب مدرسہ کی حیرانی وپریشانی قابل دید ہوتی ہے۔ عام طلباء کا کیا ذکر، مدرسے کے بڑے بڑے اساتذہ بھی اس مصری یا شامی مہمان سے عربی میں گفتگو کرتے ہیں تو بہت رک رک کر، اور ڈر ڈر کر اور اکثر جملے زبان سے غلط نکل جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات ہندوستان کے علماء کی نسبت کوئی اچھا خیال لے کر واپس نہیں جاتے۔[۱۵] لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ان مدارس میں عربی ادب کی تعلیم کا صحیح انتظام ہوتا اور ان کے ذریعے ملک میں عربی زبان کی ترویج واشاعت کا کام بھی انجام پاسکتا تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے اور نہ ہی یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ احباب کو اسلام اور اسلامیات سے اتنا بعد ہوتا جتنا کہ آج دیکھا جارہا ہے۔[۱۶]

(ج) تعلیمی ترقی واصلاح۔ علمائے کرام کی ذمہ داری:

مولانا تعلیمی ترقی و اصلاح کے لئے علمائے کرام کے کردار کو کلیدی قرار دیتے ہیں آپ کے خیال میں علمائے کرام ہی مسلمانوں میں صحیح مذہبی وسیاسی فکر پیدا کرسکتے ہیں اور اس

ضمن میں آپ لٹریچر کی تیاری کو نہایت اہم سمجھتے ہیں[۱۶]۔ مولانا اکبر آبادی نے علمائے کرام کے سامنے ترقیاتی کاموں کا ایک جامع منصوبہ بھی پیش کیا جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ مدارس عربیہ کے نصاب کی اصلاح کر کے جدید علوم وفنون کو اس میں داخل کرنا۔

۲۔ تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ کا انتخاب کرنا جو علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ طلباء کی دماغی تربیت کر کے اُن میں مضبوط کیریکٹر بھی پیدا کرسکیں۔

۳۔ عوام کی تعلیم کا بندوبست کرنا، بالخصوص دیہاتوں میں جابجا مفید نصاب تعلیم کے مدارس و مکاتب جاری کرنا۔

۴۔ ملک میں مذہبی و سیاسی لٹریچر بیش از بیش مہیا کرنا اور کثرت سے اس کو شائع کرنا۔

۵۔ مسلمانوں میں فوجی اسپرٹ اور صحت وتوانائی جسمانی پیدا کرنے کے لئے قریہ بقریہ شہر بشہر ورزش گاہیں قائم کرنا کہ انسان کا جسم تندرست ہوتا ہے تو اس کے خیالات میں بھی علو پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کر کے غریب و مفلوک الحال مسلمانوں کے لئے ذرائع معاش مہیا کرنا۔

۷۔ مدارس عربیہ کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں پر قبضہ جما کر وہاں کے طلبہ میں صحیح اسلامی تخیل اور حب قومی پیدا کرنا۔

۸۔ فضول اور لایعنی رسوم بند کرانے کے لئے محلہ بہ محلہ ایک کمیٹی بنانا کہ وہ اہل محلہ کی نگرانی کرے اور اُن کو فضول ولغو باتوں سے بچائے۔

۹۔ مسجدوں میں ایسے اماموں کا تقرر کرانا جو عالم باعمل اور جدید ضرورتوں سے باخبر ہوں اور وہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ تو بہ تو مسائل پر مسلمانوں کے سامنے وعظ کہہ سکیں۔

۱۰۔ ملک میں ایسا اسلامی پریس مہیا کرنا جو مسلمانوں کی صحیح نمائندگی اور اُن میں دل و دماغ کی صحیح بیداری پیدا کرے۔ یہ پریس اُردو اور انگریزی دونوں میں ہونا چاہیے۔[۱۷]

(د) مطالعہ وتحقیق کی ضرورت:

مولانا اکبر آبادی مسلمانوں میں تعلیمی انحطاط کی بنیادی وجہ مطالعہ وتحقیق کے فقدان کو قرار دیتے ہیں آپ کی نظر میں یہ فقدان قدیم اور جدید دونوں طبقوں میں پایا جاتا ہے مولانا نے علمی ذوق کے اس انحطاط وفقدان کے اسباب وعوامل کی نشاندہی بھی کی اور اس کی اصلاح کے لئے چند تجاویز بھی دی ہیں۔ آپ کے خیال میں اس علمی ذوق کے انحطاط و فقدان کی درج ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں خالص علمی ذوق کا مطالعہ اور شوق نہ ہونے کی وجہ مولانا کے خیال میں ان لوگوں کے پیش نظر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد آئندہ زندگی کے لئے بہتر سے بہتر راہ اختیار کرنے پر ہوتی ہے اور ان کی ساری علمیت اور قابلیت اسی کے لئے وقف رہتی ہے اور ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ اپنے اوقات کا ایک قلیل حصہ اپنے ملک کے سنجیدہ اور ٹھوس علمی لٹریچر کے مطالعے کے لئے وقف کرے۔[۱۸]

۲۔ پھر آپ نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں اور جن کی زندگیاں خالص علم کی خدمت کے لئے وقف ہونی چاہیے ان میں بھی علمی مطالعہ اور تحقیق کا ذوق نہ ہونے کی وجہ آپ نے ان میں عدم دلچسپی کا پایا جانا قرار دیا ہے۔ ان پروفیسرز کے بارے میں آپ کا کہنا ہے کہ جن کی زندگیاں خالص علم کی خدمت کے لئے وقف ہونی چاہیے تھیں اُن میں سے اکثر کا شب و روز اس طرح بسر ہوتا ہے کہ وقت مقررہ پر کلاس روم میں گئے اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے جو کچھ اُنہیں پڑھانا ہے وہ پڑھا دیا۔ اس کے بعد ان کو نہ علمی مطالعے سے کوئی واسطہ اور نہ اپنے ہی مضمون پر تحقیق کرنے سے سروکار، تعلیم وتدریس کے گھنٹوں کے علاوہ ان کے تمام اوقات دوست احباب کی ملاقاتوں، خوش گپیوں اور تفریحات کے لئے وقف رہتے ہیں۔ آپ کو ہندوستان میں کتنے ہی پروفیسر ملیں گے جو بڑی بڑی نامور یونیورسٹیوں میں مختلف مضامین کے استاد ہیں مگر جب کبھی اپنے قلم کی روانی دکھانے

کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے لئے وہ ہمیشہ "افسانہ نگاری" یا "نظم گوئی" کا میدان تلاش کرتے ہیں۔[۳۹]

۳۔ اسی طرح قدیم تعلیم یافتہ طبقے میں مطالعہ و تحقیق کے فقدان کی وجہ مولانا کی نظر میں یہ ہے کہ ان حضرات کا درس و افتاء کی چہار دیواری اور ظواہر احکام کے حصار میں مقید و محدود رہتا ہے[۴۰]۔ چونکہ ان کی پڑھنے اور پڑھانے کی محدود دنیا ہوتی ہے اور انہیں اس کی خبر نہیں ہوتی کہ باہر دنیا میں علمی کارناموں کی رفتار کیا ہے اور نہ ہی اپنے اسلاف کے علمی تحقیق و تلاش کے سلسلے میں عظیم الشان کارناموں کی خبر ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کتنے تصنیفی ادارے ہیں اور وہ کیا کیا کام کر رہے ہیں۔[۴۱]

مولانا اکبر آبادی نے علمی ذوق اور مطالعہ و تحقیق کے کاموں میں عدم دلچسپی کی اور دوسری وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ:

ا۔ انہی لوگوں میں بڑی اچھی استعداد رکھنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن ماحول ایسا بن گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی استعداد سے کام لے کر نہ اپنے اوقات کو علمی تحقیق و تفتیش میں صرف کر سکتے ہیں اور نہ وہ اپنے علمی ذوق کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ کیونکہ مولانا کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مدرس ہے تو اسے دن بھر میں آٹھ آٹھ نو نو مختلف مضامین کے سبق پڑھانے ہوتے ہیں پھر چونکہ تنخواہ کم ہوتی ہے۔ اس بناء پر اخراجات پورا کرنے کے لئے درس کے علاوہ کوئی اور دھندا بھی کرنا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ پھر ایسا مصروف شخص اتنا وقت کہاں سے لاسکتا ہے کہ وہ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی کرے اور اس کے ذریعے فنی کمال پیدا کرے۔[۴۲]

۲۔ علمی ذوق کے انحطاط و تنزل میں بڑا دخل مولانا اکبر آبادی نے اُن نظم کمپنیوں اور شاعروں کی کثرت کو بھی کہا ہے جنہوں نے فنی شاعری کو تباہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں مولانا کہتے ہیں کہ جہاں دو چار شعر اُلٹے سیدھے موزوں کر دینے کے بعد

حسن ترنم سے مشاعرہ میں ان کو پڑھ دینے سے یا کسی نظم کمپنی میں بہت ہی ارزاں قسم کے گیت اور غزلیں لکھ دینے سے شعروں کو داد ملنی شروع ہوئی اور شاعر نے سمجھ لیا کہ وہ فن کے کمال تک پہنچ چکا ہے اور اب اس کو کوئی غرض نہیں ہوتی کہ فن کا مطالعہ کرے، اساتذہ سے استفادہ کرے، ان کے شعری مجموؤں سے اپنے فن میں نکھار لائے اور اصول فن کا پابند رہ کر مشق سخن بہم پہنچائے۔[۴۳]

۳۔ اس کے علاوہ مولانا کے خیال میں ہر مسجد میں ترجمہ قرآن مجید، مذہبی جلسوں کی بھر مار، کچھ نیم سیاسی انجمنوں کی سرگرمیاں ان سب کو بھی علمی ذوق کے انحطاط و تنزل میں بہت بڑا دخل ہے۔[۴۴]

مولانا اکبر آبادی نے اس علمی انحطاط و تنزل کی نشاندہی کر کے جس کی رفتار آپ کی نظر میں نہایت ہی خطرناک ہے فوری طور پر اس کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کیونکہ آپ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اگر اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو عین ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آجائے کہ ہمارے اسلاف کرام کے علمی خزانے تاریخ کا ایک گم شدہ یا فراموش کردہ ورق ہو کر رہ جائیں اور کوئی بھی ایسا نہ نکلے جو ان کے نام سے بھی آشنا ہو اس صورت حال کو آپ قوم وملت کی تہذیب اور اس کے کلچر کی موت کہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی نظر میں ایک قوم کے کلچر اور اُس کا سرمایہ علمی کی موت خود اس قوم کی موت ہے۔[۴۵]

لہٰذا ایسے موقع پر آپ علمائے کرام اور ارباب حل و عقد دونوں کا فرض سمجھتے ہیں کہ وہی اس کے تحفظ اور بچاؤ کا سروسامان کر سکتے ہیں اور اس کا حل تلاش کر سکتے ہیں آپ نے اس کے لئے مختلف تجاویز بھی دی ہیں آپ کا کہنا ہے کہ:

ا۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو ایسی درس گاہوں میں اسلامی تحقیقات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے جس میں اسلامی علوم وفنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بڑے سے بڑا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور فارغ التحصیل طلباء میں سے دو چار ہونہار، ذہین محنتی اور صاحب ذوق طلباء کا انتخاب کر کے ان سے کسی بڑے عالم اور محقق کی

نگرانی میں اس شعبہ میں کام کرایا جائے۔ ہر طالب علم کو کم از کم سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے اور اس کے ذوق اور صلاحیت کے مطابق کسی ایک موضوع کا انتخاب کرکے اس پر اس سے ریسرچ کرائی جائے اور اس شعبے میں کام کرنے کی مدت کم از کم تین سال رکھی جائے۔

۲۔ اس کے علاوہ آپ اس کی بھی ضرورت سمجھتے ہیں کہ سال بھر میں کم از کم ایک مہینے کے لئے مدارس عربیہ کا کسی جگہ پر سیمینار منعقد کرایا جائے جس میں مختلف علوم وفنون کے ماہر اساتذہ شریک ہوکر مختلف مباحث پر لیکچر دیں، بحث و مباحثہ اور مذاکرہ کریں اور اس طرح طلباء میں علمی ذوق کی تربیت اور اس کی آبیاری کریں۔ [۲۶]

۳۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا اکبر آبادی اسلامی تحقیقات کے سلسلے میں تین عنوانوں پر کام کرنا زیادہ اہم سمجھتے ہیں جن میں تاریخ اسلام، فلسفہ اسلام اور اسلامی دینیات شامل ہیں۔ مولانا اکبر آبادی اس کی اہمیت یہ بتاتے ہیں کہ یونیورسٹیوں میں مذکورہ بالا تین مضامین کے جو پرچے ہوتے ہیں ان کی تیاری کے لئے ہمارے نوجوان طلباء و طالبات اور اساتذہ سب اُن کتابوں پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور ہیں جو یورپ اور امریکہ میں لکھی گئی ہیں۔ مولانا کا ماننا ہے کہ مستشرقین یورپ کا علمی ذوق، محنت وجستجو، ترتیب مواد اور تصنیف وتحقیق کی صلاحیت و استعداد سب اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن چونکہ اُن کا نقطۂ نظر اسلامی نہیں ہوتا اور وہ اسلامی احکام ومسائل کی اصل اسپرٹ سے براہ راست واقف نہیں ہوتے اس بناء پر ان کی تحقیق کے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بسا اوقات صحیح نہیں ہوتے اور ان سے طرح طرح کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوجاتی ہیں اس بناء پر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ صحیح الخیال محقق مسلمان اسلامی تاریخ وفلسفہ اور اسلامی دینیات پر خود انگریزی میں کتابیں لکھیں تاکہ تصویر کا صحیح رُخ سامنے آسکے اور یہ کام ایک دو سال کا نہیں برسوں کا ہے اور ایک دو آدمیوں کے کرنے کا نہیں بلکہ پوری ایک جماعت یا بورڈ کے کرنے کا ہے اور پھر ضمنی طور پر کرنے کا نہیں بلکہ مستقل طور پر ایک اصلی اور بنیادی

حیثیت سے انجام دینے کا ہے۔ [۲۷]

مقاصدِ تعلیم کے ذیل میں مولانا اکبر آبادی نے جن ترجیحات کی نشاندہی کی ہے اُس کو وقت اور حالات کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا اکبر آبادی بحیثیت ماہر تعلیم کے تعلیم کے مسلمہ مقاصد سے بخوبی واقف تھے وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ تعلیم کا بنیادی مقصد کیا ہے اس کا اظہار زیر نظر موضوع کی آئندہ سطور میں بھی آرہا ہے تاہم مولانا نے صرف اُن تعلیمی مقاصد کی نشاندہی کی ہے جو اُس وقت کی ضرورت تھی۔

تعلیمی خامیاں ومسائل اور اس کا حل

مولانا نے ہندوستان کے تعلیمی خامیاں بالخصوص مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے جس کا ذیل میں ہم جائزہ لیں گے۔

(الف) مدارس عربیہ۔ نصاب اور طریقۂ تدریس:

مولانا اکبر آبادی نے اپنے تعلیمی افکار میں مدارس عربیہ کے نظام تعلیم اور نصاب پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے انہوں نے برہان کے متعدد شمارے اور چار قسطوں پر مشتمل اپنے طویل مقالہ (مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر) میں مدارس عربیہ میں موجودہ خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی اصلاح اور بہتری کی تجاویز پیش کی ہیں۔ کیونکہ مولانا طویل عرصہ سے مدارس عربیہ کے تعلیمی نظام کی اصلاح کی ضرورت محسوس کر رہے تھے ہر چند کہ آپ کو اس امر کا احساس اور اندازہ تھا کہ علماء کا ایک طبقہ مدارس کے نظام تعلیم میں ترامیم اور اصلاح کو قبول نہیں کرے گا لیکن آپ نے نہایت جرأتمندانہ طریقے سے قلم اُٹھایا اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

ا۔ اس ضمن میں مولانا اکبر آبادی نے سب سے پہلے تعلیم کے قدیم اور جدید تقسیم کے اسباب ومحرکات کا تجزیہ کیا ہے آپ کے خیال میں انگریزوں کے اقتدار سے پہلے جو مدارس عربیہ تھے اُن کے طریقۂ تعلیم میں ہمہ گیری اور جامعیت پائی جاتی تھی۔ وہ آج کل کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھے ان مدارس میں تعلیم کا مقصد جس طرح دینی ہوتا تھا علمی بھی ہوتا تھا اور دنیوی بھی ہوسکتا تھا۔ اس میں نہ قدیم وجدید کی کوئی تفریق تھی اور نہ مولوی اور غیر مولوی کا کوئی جھگڑا تھا۔ ملک کے

تمام لوگ صرف دو ہی طبقوں پر منقسم تھے، ایک تعلیم یافتہ اور دوسرا غیر تعلیم یافتہ، آج کل کی طرح یہ امدیر نہیں تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے پر بھی یہ بتانا پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے کس طبقہ اور کس گروہ سے یعنی قدیم سے یا جدید سے تعلق رکھتا ہے جس طرح آج جدید تعلیم یافتہ کے معنی بہت وسیع ہیں جس میں انجینئر، ماہر طبعیات، ڈاکٹر، وکیل غرض کہ سائنس اور آرٹ کے کسی شعبے کے گریجویٹ سب تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہوتی ٹھیک اسی طرح مسلمانوں کے عہد حکومت میں علوم دینیہ اور علوم وفنون غیر دینیہ سب کے جاننے والوں کو علماء کہتے تھے لیکن جس طرح مطلق تعلیم یافتہ ہونے کے بعد خاص خاص علوم وفنون میں کمال و مہارت کے اعتبار سے اس علم کی طرف نسبت کرکے ہر ایک کا جدا جدا نام ہوتا ہے مثلاً فلسفہ کے ماہر کو فلسفی (فلاسفر)، منطق کے فاضل کو منطقی (لوجیشین)، سائنس کے باکمال کو سائنٹسٹ کہتے ہیں اسی طرح زمانہ زیر بحث میں حدیث کے مبصر کو محدث، تفسیر کے فاضل کو مفسر، علم کلام کے ماہر کو متکلم اور تاریخ کے امام کو مورخ کہتے تھے۔ان مدارس کے فارغ التحصیل طلباء میں جہاں محدث، مفسر، فقیہ اور مفتی ہوتے تھے بعض مورخ، فلسفی، ماہر طبعیات، طبیب اور ماہر ریاضیات بھی ہوتے تھے ان میں سے بعض درس وتدریس اور فقہ وافتاء کے مسند کی رونق بنتے تھے تو اُن ہی میں کچھ ہوتے تھے جو امارت ووزارت اور حکومت کے دوسرے شعبوں کی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔پھر شاعر، ادیب اور مصنف بھی اُن ہی میں سے اٹھتے تھے اور مبلغ وخطیب اور کاتب بھی اُن ہی میں ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہندو بھی ان مدارس میں مسلمانوں کے ساتھ تعلیم پاتے تھے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مدارس عربیہ کا مقصد وجود صرف دینی نہیں بلکہ علمی بھی ہوتا تھا اور حکومت کی ملازمت اور عہدے وغیرہ بھی اُن ہی مدارس میں تعلیم پانے کے بعد حاصل ہوتے تھے۔[۴۰] لیکن برطانوی راج کے قائم ہوجانے کے بعد مدارس عربیہ کے نظام کا شیرازہ پراگندہ ہوگیا اور وہ ہمہ گیری نہیں رہ سکی جو پہلے تھی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم قدیم وجدید دو حصوں میں

تقسیم ہوگئی اور اس طرح تعلیم یافتہ مسلمان دو مخالف ومتضاد گروہوں میں بٹ گئے۔ آپ کے نزدیک یہ ایک دوسرے کے حلیف نہیں بلکہ حریف بن گئے جس کی وجہ سے مدارس عربیہ کا نظام عمل صرف دینی اغراض تک محدود ہوکر رہ گیا۔[۴۱] مولانا مدارس عربیہ کے نظام عمل کو دینی اغراض تک محدود ہونے کی وجہ طبعی اور قدرتی بھی سمجھتے ہیں[۴۲]۔آپ کا کہنا ہے کہ انقلاب حکومت کے خطرات کا سدباب کرنے کے لے علمائے کرام دین کے تحفظ کے لئے مدارس عربیہ کا قیام عمل میں لے کر آئے۔ لیکن اس سے ان کے نصاب وطریقہ ہر چیز کا مقصد صرف دین اور اس کا تحفظ ہوگیا اور مدارس عربیہ سے جو علمی یا دنیوی فوائد پہلے حاصل کئے جاتے تھے وہ ناقابل اعتنا ہوگئے اور اس کے مقاصد میں جو جامعیت اور ہمہ گیری تھی وہ ختم ہوگئی[۴۳]۔ لیکن ان سب فروگزاشتوں اور کوتاہیوں کے باوجود مدارس عربیہ نے ہندوستان میں دین وعلم کی جو خدمات انجام دیں آپ اُن کو شاندار اور قابل قدر کہتے ہیں۔لیکن ان کی عظمت کا صحیح اندازہ بقول مولانا اکبرآبادی اُس وقت ہوسکتا ہے جبکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی و مذہبی حالات کا موازنہ ومقابلہ اُسی زمانے کے ممالک اسلامیہ کے ساتھ کیا جائے[۴۴]۔مولانا جدید حالات اور قومی و بین الاقوامی انقلابات وتغیرات کے شدید تقاضے کو دیکھتے ہوئے مدارس عربیہ میں عہد جدید کے علمی تقاضوں کے مطابق نصاب وطریقہ تعلیم میں تبدیلی کرنے پر زور دیتے ہیں۔کیونکہ آپ کا کہنا ہے کہ آج یورپ اور امریکہ کے محققین نے اسلامی علوم و فنون سے متعلق جو کاوشیں کی ہیں انہوں نے اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ، اسلامی فقہ اور اسلامی علم الکلام ان میں سے ہر چیز کے متعلق بحث و استدلال اور غور وفکر کے طریقے کو بدل دیا ہے اور اس میں اتنی وسعت پیدا کردی ہے کہ جب تک کوئی عالم اس طرز سے آشنا نہیں ہوگا وہ عملی طور پر اسلام کی خدمت ہرگز نہیں کرسکتا۔[۴۵]

۲۔ اسی طرح مولانا اکبرآبادی نے موجودہ درس نظامی کو بھی اُس کی موجودہ ہیئت دینی